مستشرقین کا اسلوبِ سیرت نگاری اور مولانا عبد الماجد دریابادی

تحسین فراقی ﷺ

اسلام اور حضور اکرم ﷺ صدیوں سے اہلِ مغرب کے لیے موجبِ توجہ رہے ہیں اور اس کے چند در چند اسباب ہیں۔ اکیسویں صدی کی فضا بھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اسلام، اہلِ اسلام اور نبیِ اسلام ﷺ کے تواتر کے ساتھ ذکر سے گونج رہی ہے۔ گو کہ یہ ذکر اہلِ مغرب کے ہاں پہلے اور اب بیشتر بہ رنگِ دیگر رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ خلیجی جنگ اور ستمبر ستم گر کے بعد تو وہاں اب "اسلاموفوبیا" اور "اسلاموفاشزم" جیسی منفی اصطلاحات بھی وجود میں آ چکی ہیں۔ ایک مدت سے مغرب کی تہذیبِ جدید میں "استشراق" بہ طور ایک فن اور پیشے کے ظہور میں آ چکا ہے۔ دراصل مذہبِ عیسائیت کے بعد سب سے بڑے اور آخری سماوی دین کے طور پر ظہور کا دعویٰ کرنے والا نظام حیات و کائنات -اسلام- عیسوی دنیا اور اس کی دانش وری کی توجہ جذب کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، مگر افسوس یہ ہے کہ "استشراق" کا آغاز جس نیت سے کیا گیا اس کے نتیجے میں خشتِ اوّل سے ثریا تک دیوار کی کجی، تعصب کے خمیر میں گندھی اور دشنام و دجل کی گچ کاری سے داغ داغ نظر آتی ہے اور دجل، فریب کاری، تعصب اور تنگ نظری کا یہ سلسلہ اس اکیسویں صدی میں بھی جاری ہے۔ اسلام اور نبیِ اسلام ﷺ کے بارے میں جس پہلے قابلِ ذکر شخص نے اس افسوس ناک مہم کا آغاز کیا وہ بارہویں صدی عیسوی کا پیٹر- دی وینریبل (Peter – The Venerable) ہے مگر اُس کے بعد اِسے زیادہ منصوبہ بندی اور قوّت کے ساتھ جس شخص نے شروع کیا، وہ ایک مشہور پادری ریمنڈ لل (Lull) تھا، جس نے اُس زمانے کے پوپ کی اشیر باد سے مغربی دانش گاہوں میں عربی اور علوم اسلامی کی تعلیم کا اجرا کیا۔ مقصود یہ تھا کہ اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کی جا سکیں تاکہ بہ قول اس کے نہ صرف اس نئے "کفر وارتداد" (اسلام، خاکم بہ دہن) کا مقابلہ کیا جا سکے بلکہ اس دین کے گم راہ مقلدین کو "عیسائیت" کی روشنی دکھائی جا سکے۔[1] اس لیے ریمنڈ لل کو یورپ میں علومِ اسلامی کا بنیاد گزار کہا جاتا ہے۔

ﷺ ڈائریکٹر، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۱۔ راقم نے یہ معلومات پروفیسر ظفر علی قریشی کی قابلِ قدر کتاب *Prophet Muhammad and His Western Critics* (Lahore: Idara Ma'rif Islami, 1992) سے اخذ کی ہیں، دیکھیے: ۱: ۳۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ریمنڈ لل سے قاتل ریمنڈ ڈیوس تک بیشتر ایک ہی کہانی ہے۔ دجل، فریب، تباہ کاری، دشنام طرازی، رسوا سازی اور تقلیبِ حقائق کی۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کہیں یہ دجل خوش نما عبارتوں میں لپٹا بین السطور جھلکتا ہے اور کہیں بالکل کھلا ہوا، حقائق کا منہ چڑاتا نظر آتا ہے۔ یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ "استشراق" کی زیادہ تر طاقت و توانائی استعماری قوتوں کی مرہونِ منّت رہی ہے، اور یہ سلسلہ ریمنڈ لّل سے منٹگمری واٹ تک اور ولیم میور، اشپرنگر، سنُوک ہرگرونژے سے لے کر برنارڈ لیوس، جوزف شاخت، ہنٹنگٹن اور فوکویاما وغیرہ تک پھیلا نظر آتا ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے یورپی عیسائی جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا عیسائیت کے بعد ظہور کرنے والے دین کو کفر و ارتداد سمجھتے تھے۔ این میری شمل لکھتی ہیں کہ شاید اسی باعث حضور اکرم ﷺ کے باب میں اہل یورپ میں یہ اسطور پھیلائی گئی تھی کہ وہ خاکم بدہن "باغی لاٹ پادری" Cardinal Renegade ہیں۔ (۲) رہا استعمار و استشراق کا گٹھ جوڑ تو اس کی عبرت ناک تفصیل ایڈورڈ سعید کی معرکہ آرا کتاب *Orientalism* میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال نے کس قدر درست کہا تھا:

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسیا کے سفیر

ایسا نہیں ہے کہ مستشرقین کا ہر ہر فرد قابلِ ردّ ہے یا ان کی علمی، تحقیقی اور تدوینی خدمات کسی درجے میں بھی قابلِ توجہ نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ مغرب میں اسلام اور حضور ﷺ کے خلاف عہدِ وسطیٰ میں پروان چڑھنے والا تعصب اور جنون بعد کی صدیوں میں کم نہیں ہوا؛ ہوا اور ضرور ہوا مگر اکیسویں صدی کے آغاز میں اب پھر سے ایک نئی شدت کے ساتھ شعلہ فشاں اور زہر چکاں ہے۔

دراصل مستشرقین کے گروہ میں بیشتر وہ لوگ رہے ہیں جو پادری اور مشنری تھے۔ ان کا اسلام سے تعصب قابلِ فہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مستشرقین کی حیران کن تحقیقات کی تہ میں، جو حواشی و تعلیقات اور مصادر و مراجع کے بھاری بھرکم پن کے ساتھ قاری کو متاثر اور مرعوب کرتی ہیں، ظن و تخمین اور ادعائیت کا ایک ایسا غیر علمی انبار لگا ہوتا ہے، جس کا کوئی ٹھوس ثبوت سرے سے فراہم ہی نہیں ہوتا۔ پھر مستشرقین کا سارا زور قرآن کے یہودی اور عیسوی منابع ثابت کرنے پر لگتا رہا ہے۔ مستشرقین اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہیں کہ اہلِ اسلام کی نہایت بنیادی کتاب پر سے اعتماد اٹھا دینے کے نتیجے میں مسلمانوں کو فکری ہزیمت سے دوچار کرنا اور ان پر

2 – See: Murad Hofmann, *Islam: The Alternative* (Maryland: Amana Publications, 2000), xiii.

قابو پانا بہت آسان ہے۔ مستشرقین اس امر کا ادراک نہیں کرتے یا نہیں کرنا چاہتے کہ اگر قرآن کہیں کہیں صحفِ سابقہ سے مماثل ہے بھی تو اس کا سبب یہ نہیں کہ اس کا ذخیرۂ رشد و ہدایت و حکمت و صداقت، یہودیت اور عیسائیت سے اخذ کردہ ہے، بلکہ یہ ہے کہ تمام مذاہب آسمانی کا منبع وحی الٰہی ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ خالص مادہ پرستانہ ماحول میں پرورش پانے والے مستشرقین یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ قرآن "تنزیل لفظی" ہے اور ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایچ اے آر گب جو مستشرقین میں نسبتاً معتدل عالم کے طور پر معروف ہے، بہ ظاہر قرآن کے "تنزیل لفظی" ہونے کے بارے میں کوئی رائے نہیں دیتا، مگر اس کی تحریر کے بین السطور سے صاف تشکیک آفرینی کی بُو آتی ہے، وہ لکھتا ہے:

> Whatever the psychological explanation may be, it is difficult to resist the conclusion that the term "revelation" was confined to those utterances which were not consciously produced and controlled by the prophet and seemed to him to have been put into his mouth from without.[3]

("وحی" کی نفسیاتی تشریح جو بھی ہو، اس نتیجے سے انکار ممکن نہیں کہ اس سے مراد بس وہ تکلم ہے جو نبی سے شعوری طور پر تخلیق یا ضبط نہیں ہوا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی گویائی پر خارج سے جاری کیا گیا۔)

مولانا عبد الماجد دریابادی (۱۸۹۳–۱۹۷۷ء) نے جہاں ایک طرف استشراق کے بعض مثبت پہلوؤں کی تحسین کی، وہیں اس کے منفی پہلوؤں پر بھی شدّ و مدّ اور تواتر سے لکھا۔ اس ضمن میں ان کی بعض تحریریں مثلاً: "اسلام حریفوں کی نظر میں" (**سچ**، ۲/اگست ۱۹۲۶ء)، "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، نیا ایڈیشن" (**صدقِ جدید**، ۱۲/دسمبر ۱۹۵۸ء)، "اسلام پر مستشرقین کی نظر کرم" (۲۵/اکتوبر ۱۹۶۳ء)، سچی باتیں (**صدقِ جدید**، یکم/نومبر ۱۹۶۳ء)، سیرتِ نبوی ﷺ اور علمائے فرنگ (مشمولہ **سلطان ما محمد** ﷺ) اور "ایک مستشرقانہ ایچ" (**صدقِ جدید**، ۷/اکتوبر ۱۹۶۶ء) بڑی چشم کشا اور قابلِ توجہ ٹھہرتی ہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ یورپ صلیبی جنگوں کے زمانے سے، جس میں اسے پے در پے شکستیں ہوئیں، اسلام کو اپنا اصل مدمقابل سمجھتا رہا ہے اور عیسوی حربی اتحاد کی خاطر اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرتا رہا ہے۔ مولانا دریابادی کو اس کا بہ خوبی احساس تھا۔ وہ استشراقی حربوں اور مستشرقین کی نفسیاتی چالوں کا نہایت گہرا ادراک رکھتے تھے۔ مسلّمات اور یقینیات میں رخنہ اندازی، دھیمے اور خوش گوار لہجے کے ذریعے شیریں زہر چکانی

3– Sir Hamilton Gibb, *Muhammadanism* (Oxford: Oxford University Press, 1960), 30.

اور تشکیک آفرینی مستشرقین کے مخصوص ہتھیار ہیں جن سے وہ اب تک کام لے رہے ہیں۔ ان پر مستزاد ان کا مادہ پرستانہ تصور حیات ہے؛ ان سب پر مولانا دریابادی کی گہری نظر تھی۔ ۱۹۲۶ء کی مسلم دنیا کے شدید آشوب کے تناظر میں یورپ کے تجسس، اضطراب اور اس کے رد عمل کا ذکر کرتے ہوئے وہ بعض اہم حقائق کی نشان دہی کرتے ہوئے، لکھتے ہیں:

یورپ آج سے نہیں، مدت سے اپنا اصلی حریف اسلام ہی کو سمجھتا آرہا ہے۔ جب تک کلیسا کی قوت قائم رہی اس وقت بھی اور اب جب کہ کلیسا کی جگہ مادیت نے لے لی ہے، اب بھی اہل فرنگ اپنا اصلی مدمقابل اسلام ہی کو سمجھ رہے ہیں۔ جو خطرہ انہیں توحید کے امانت داروں اور محمد عربی ﷺ کی امت کہلانے والوں سے لگا رہتا ہے وہ دنیا میں اور کسی سے نہیں۔ یہیں سے یہ ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں، دنیائے اسلام کی ہر جنبش پر، امتِ اسلامیہ کی ہر حرکت پر یورپ کی گہری نظر رہتی ہے اور پردۂ زمین پر اسلامی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کی جاسوسی پر دانایانِ فرنگ کے پہرہ دار مقرر نہ ہوں۔ ہر نبض کی جنبش پر، ہر سانس کی حرکت پر یورپ کی سرگوشیاں ہیں۔ ہر ہر لحہ وہ جانچتا ہے اور تولتا ہے، ٹٹولتا ہے اور انداز تا ہے کہ جس کو وہ اپنا اصلی حریف سمجھے ہوئے ہے اس کی زندگی کا پارہ اب چڑھاؤ یا اتار (کے) کس درجے پر ہے۔ (۴)

کیا ۱۹۲۶ء کی مولانا دریابادی کی یہ تحریر تقریباً پچھتر چھہتر برس بعد امریکہ سے شائع ہونے والی کتاب *Clash of Civilizations* کے اس اعلان کی تصدیق کنندہ نہیں کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اب عیسائی دنیا کو اصل خطرہ صرف اسلام سے ہے، ایسا خطرہ جسے ہنٹنگٹن "سبز خطرے" سے تعبیر کرتا ہے؟

"اسلام پر مستشرقین کی نظر کرم" میں مولانا دریابادی جو کچھ فرماتے ہیں وہ مستشرقین کے سلسلے میں ان کے موقف ہی کی بہ خوبی وضاحت نہیں کرتا، مغرب کے ناقص تصورِ علم کی بھی قلعی کھولتا ہے:

اسلامیات پر قلم اُٹھانے والے مستشرقین کی ایک جماعت کا رویہ تو ہمیشہ سے معاندانہ، مخالفانہ اور متعصبانہ رہا ہے، بلکہ بعض تحریریں تو کھلی ہوئی بدزبانی اور سب و شتم کی مثالیں ہیں، خصوصاً آج سے ڈیڑھ دو صدی قبل کی تحریریں-رفتہ رفتہ لب و لہجہ کی تلخی و خشونت میں اصلاح ہوتی گئی اور اب ان کی تنقیدیں عموماً نرم و غیر دل آزار زبان میں ہونے لگی ہیں، لیکن جو مہذب و شیریں زبان لکھتے ہیں ان کے قلم سے بھی کبھی نہ کبھی کوئی ایسی بات نکل ہی جاتی ہے جو اسلام کے کسی عقیدے کی ہادم یا اسے پڑھنے والی نظر میں مشکوک و مشتبہ بنا دینے والی ہو اور ریسرچ کے معنی ہی تو ان کے ہاں ٹھہر گئے ہیں مسلمات و یقینیات میں شک و شبہ پیدا کرنا اور ان میں رخنے ڈالنا۔۔۔۔۔۔ اس کی بنیاد ضروری نہیں کہ اسلام دشمنی ہی پر ہو۔ یقین کی جگہ بے یقینی، سکون کی جگہ مسلسل بے چینی اور اطمینان کی جگہ بے اطمینانی فرنگی ذہنیت کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے اور اس کا اظہار ان کے سارے ہی علمی و "تحقیقی" کاروبار میں ہو رہا ہے۔ (۵)

۴- عبدالماجد دریابادی، **سچ**، ۲ (اگست ۱۹۲۶ء)، ۳۔

۵- عبدالماجد دریابادی، **صدقِ جدید**، لکھنؤ، (۱۵/ اکتوبر ۱۹۶۳ء)، ۸۔

اپنے ایک اور مقالے ''مستشر قانہ اپچ'' میں مولانا دریابادی نے ان علما کی کم علمی اور خود فریبی پر اظہارِ افسوس کیا ہے جن کے خیال میں مستشر قین کا گروہ نظر انداز کر دیے جانے کے قابل ہے۔ اس ضمن میں مولانا نسبتاً غیر معروف فرانسیسی مستشرق جوزف شیلہود Chelhod کی اسلامیات کی ایک کتاب پر ہونے والے ریویو کے ضمن میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مقصود اس (تحریر) سے یہ دکھانا ہے کہ ہمارے ہاں کے جو علما اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ فتنۂ استشراق صرف دس بیس یا سو پچاس افراد تک محدود ہے یا صرف چند فرسودہ اور گھسے پٹے موضوع ہیں جن پر وہ اب تک لکھے چلے جا رہے ہیں، وہ کتنے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں ایسے شخص امریکا اور یورپ میں ہیں جو اپنی زندگیاں اسلامیات پر لکھنے لکھانے کی نذر کیے ہوئے ہیں اور ہالینڈ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس، اٹلی، کینیڈا، امریکا، سویڈن، لبنان وغیرہ میں بیسیوں نہیں پچاسوں بڑے بڑے مرکز ایسے قائم ہیں جہاں دن رات یہی کام ہو رہا ہے۔ بیسیوں رسالے سہ ماہی، چوماہی، چھ ماہی، انہی موضوعوں پر نکل رہے ہیں اور عنوانات نت نئے نکلتے چلے آتے ہیں--- کاش ہمارے ہاں کے مخلص و خیر اندیش لیکن چشم بند علما کو اس کا اندازہ ہو تا کہ دین کو آج جن فتنہ سامانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی نظیر ۱۴ سو سال کی تاریخ میں نہیں ملتی۔[۶]

مستشر قین کی اس نوعیت کی فتنہ پر دازیوں کا احساس عرب دنیا کے بعض اہم محققین کو بھی ہو چکا تھا، مثلاً ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم اور ممتاز مصری عالم اے ایل طباوی۔ سباعی نے استشراق کے سیاسی محرکات کے ضمن میں ایک بڑی اہم بات لکھی ہے کہ مستشر قین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہر اول دستہ رہے ہیں۔ مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ان کا کام ہے۔ وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریقِ بود و ماند اور زبان و ادب، بلکہ جذبات ونفسیات سے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات فراہم کرتے ہیں تاکہ ان پر اہلِ مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو۔

مولانا دریابادی کا ایک نہایت اہم مقالہ ''سیرتِ نبوی اور علمائے فرنگ'' ہے۔ اس مقالے میں مولانا نے بعض معروف مغربی سیرت نگاروں مثلاً جارج فنلے، ولیم میور اور کارلائل کی تحریروں سے اعتنا کیا ہے اور ان کے اسلوب اور استدلال کی بعض کم زوریوں کو نمایاں کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ مستشر قین کی ایک قابلِ لحاظ تعداد حضور اکرم ﷺ کی سیرت کی تحسین کی اہل ہی نہیں۔ ان کی ماڈی تربیت اور زمہریری عقل پرستی ایک خاص سطح اور

۶- دریابادی، نفسِ مصدر (۷/اکتوبر۱۹۶۶ء)، ۵-۶۔

ایک خاص مقام سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ مولانا دریابادی کے نزدیک بعض مستشرقین بہ ظاہر تو حضور ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کے قائل نظر آتے ہیں، لیکن وہ حضور ﷺ کو صرف اور صرف ایک غیر معمولی انسان اور ایک عظیم مصلح و مقنن کے روپ میں دیکھتے ہیں اور انھیں مامور من اللہ یا وحیِ الٰہی کے فیض یافتہ کے طور پر ماننے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ چناں چہ ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد کم زور عقیدے کے مسلمان کے نزدیک حضور ﷺ کی حیثیت بجائے اللہ کے برگزیدہ اور سچے نبی کے، محض ایک مخلص و نیک نیت مصلح وقت کی رہ جاتی ہے۔ مولانا چوں کہ خود ایک عرصے تک ان دوست نما دشمن مستشرقین کے دجل و دسیسہ کاری کا شکار رہ چکے تھے، اس لیے وہ اس فریب کاری سے خوب آگاہ تھے۔ ان کے نزدیک حضور اکرم ﷺ کو اللہ کا برگزیدہ نبی سمجھنے کے بجائے انھیں صرف مصلح اور بطلِ اعظم سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے صوبے کے گورنر سے کہا جائے کہ حضور والا کے اختیارات کا کیا کہنا، آپ پٹواریوں سے بڑھ کر اختیارات رکھتے ہیں۔ لائیڈن یونیورسٹی کے تاریخ مذاہب کے پروفیسر ڈاکٹر کریمر سے بھی انھیں یہی شکوہ ہے کہ اس نے اپنی معروف کتاب *World Cultures and World Religions* میں حضور ﷺ کی دنیاوی کامیابیوں ہی کی تحسین کی ہے۔ اصل میں حضور اکرم ؐ کو محض ایک عظیم سیاسی لیڈر قرار دینے والوں میں کئی اہم نام آتے ہیں۔ والٹیر نے اپنی کتاب *Essai sur les moeurs et l`esprit des nations* (۱۷۵۶) میں ایک جگہ حضورؐ کا مقابلہ کرامویل سے کیا ہے اور ان کے کارناموں کو انگلستان کے اس نجات دہندہ سے عظیم تر قرار دیا ہے۔ صرف مادّی کامیابیوں پر نگاہ رکھنے والے ایسے ہی کوتاہ بینوں کو پیر رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مشورہ دیا تھا: لفظ بگذاری سوے معنی روی[۷]

مستشرقین میں سے بعض نے ہمارے ہاں قبول عام پایا ہے، انھیں میں ایک نام کارلائل (۱۷۹۵-۱۸۸۱) کا بھی ہے جسے ہمارے بڑے بڑے علما اور سیرت نگاروں نے ایک منصف مزاج مؤرخ کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ایسے اہم لکھنے والوں میں سرسید اور شبلی بھی آئے ہیں اور سید سلیمان منصورپوری بھی۔ کارلائل کی مشہور کتاب *On Heroes, Hero – Worship, and the Heroic in History* میں اس کے جو چھے لیکچر موجود ہیں، ان میں دوسرا لیکچر، *The Hero as Prophet. Mahomet: Islam* کے عنوان سے شامل ہے۔ دراصل کارلائل اس بات کا قائل تھا کہ انسانی تاریخ عظیم انسانوں کے سوانح پر مشتمل ہے، جس سے نوعِ انسانی فیض حاصل کر سکتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ ممتاز شاعر اور بے مثل ڈرامہ نگار گوئٹے (۱۷۴۹-۱۸۳۲)

۷- تفصیل کے لیے دیکھیے: **صدقِ جدید** (۵ر مئی ۱۹۶۷ء) میں مولانا کا شذرہ بہ عنوان: ”سیرتِ نبوی اور کج نظری“۔

سے شدید طور پر متاثر تھا جس نے اپنی ابتدائی زندگی میں حضور اکرم ﷺ کی سیرت سے متاثر ہو کر ایک شاعرانہ ڈرامہ لکھنے کا آغاز کیا تھا جو نامکمل رہا۔ فلپ کے ہٹی کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک انگریز اور فرانسیسی پروفیسروں کی ابتدائی کوششوں اور جرمن شاعروں اور عالموں کی مزید کمک کے نتیجے میں مسلم کلچر کے بارے میں تبدیلی واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔[۸] کارلائل نے حضور ﷺ کی ذات کو "نبی بحیثیت ہیرو" کے حوالے سے منتخب کر کے ایک نئے رجحان ہی کی سمت نمائی نہیں کی تھی، بلکہ اسے ایک سرعت اور تیز رفتاری بھی عطا کر دی تھی۔[۹]

شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ کارلائل کا مذکورہ بالا دوسرا لیکچر حضور ﷺ کی شخصیت کے بارے میں یورپ کے نہایت متعصبانہ اور جارحانہ طرزِ عمل کے خلاف بہت حد تک ہم دردانہ ردِّ عمل اور ایک نہایت اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیکچر کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ کارلائل حضور کی سیرت کا بہت حد تک ڈوب کر مطالعہ کرتا ہے اور ان کی عظمتوں کو خراج پیش کرنے میں فیاضانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ وہ کہیں انھیں "Deep-hearted Son of Wilderness" (صحرا کا عمیق القلب بیٹا) کہتا ہے، کہیں "Genuine Man" (خالص انسان)، کہیں "The Brother of us all" (ہم سب کا بھائی) اور کہیں "The Veritable Son of our Common Mother" (ہم سب کی ماں کا غیر معمولی سپوت) کارلائل حضور ﷺ کی سادہ سیرت کا دل پذیر نقشہ کھینچتا ہے، ان کی عمق رسی کی تعریف کرتا ہے اور ان کی تعلیمات کا نہایت سہل مگر دل میں اتر جانے والے اسلوب میں خلاصہ کرتا ہے۔ حضور ﷺ عرب مشرکین کو بت پرستی سے کیسے منع فرماتے تھے، اس کا ایک دل کش انداز کارلائل کے ہاں ملاحظہ کریں، جس میں کمال فصاحت و بلاغت کا لہو دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

> Idolatry is nothing: these wooden idols of yours, 'Ye rub them with oil and wax, and the flies stick on them,' .....these are wood, I tell you! They can do nothing for you; they are an impotent blasphemous pretence; a horror and abomination, if ye knew

8 – Phipip Khuri Hitti, *Islam and the West: A Historical Cultural Survey (The Anvil Series)* (Princeton: Van Nostrand, 1962), 61.

9 – Thomas Carlyle, *On Heroes, Hero-Worship, and the Heroic in History* (Oxford: Oxford University Press, 1904).

them. God alone is; God alone has power; He made us, He can kill us and keep us alive: 'Allah akbar, God is great.' [10]

(بت پرستی کچھ نہیں، یہ تمھارے چوبیں بت، جن پر تم تیل اور موم لیپ کرتے ہو اور مکھیاں انھیں کچو کے مارتی ہیں۔۔۔ یہ تو لکڑیاں ہیں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں یہ تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ تو ناتواں اور مصنوعی خدا کے مقابل ہیں۔ اگر تمھیں شعور ہو تو یہ نرا خوف اور نفرت ہی ہیں۔ اللہ واحد اور صاحب قدرت ہے۔ اس نے ہمیں تخلیق کیا۔ وہی ہمیں زندگی اور موت دیتا ہے۔ اللہ اکبر! اللہ بہت بڑا ہے۔)

یقین اور درد مندی کے جلو میں جذبے میں ڈوبے کارلائل کے اس ادب پارے کا اختتام ان سطور پر ہوتا ہے جو 'کار مرداں روشنی و گرمی است' کی قوی برہان مہیا کرتی ہیں، اور ایقان کی عظمت کو آئینہ کرتی ہیں:

The history of a Nation becomes fruitful, soul-elevating, great, so soon as it believes. These Arabs, the man Mahomet, and that one Century, —is it not as if a spark had fallen, one spark, on a world of what seemed black unnoticeable sand; but lo, the sand proves explosive powder, blazes heaven-high from Delhi to Grenada! I said, the Great Man was always as lightning out of Heaven; the rest of men waited for him like fuel, and then they too would flame. [11]

(ایک قوم کی تاریخ بہت جلد ثمر بار اور روح پرور بن جاتی ہے۔ عربوں، محمد اور اس عہد کے بارے میں یوں لگتا ہے جیسے ایک گم نام صحرا پر کوئی شعلہ گر پڑا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ صحرا ایسا شعلہ افشاں ہو جاتا ہے جس سے دہلی سے قرطبہ تک ہی کی فضا جگمگا اٹھتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ رجل عظیم تو بس کوئی آسمانی نور تھا اور باقی انسانیت ایندھن کی مانند اس کی راہ تک رہی تھی کہ کب وہ آئے اور اس کی تمازت سے جل اٹھے۔)

مگر اس تمام تر کے باوجود اس خطبے میں کارلائل نے بعض مقامات پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ایسے ہی تسامحات کو مولانا دریابادی نے "سیرتِ نبوی اور علمائے فرنگ" میں نمایاں کیا ہے۔ مولانا دریابادی مستشرقین کو دو گروہوں میں بانٹتے ہیں؛ اوّل پادری اور ان کی کھلی ہوئی گندہ ذہنی، دوم عام مصنفین اور اربابِ قلم۔ اس مؤخر الذکر گروہ کو وہ مزید دو جماعتوں میں بانٹتے ہیں؛ کچھ وہ ہیں جو پیغمبرِ اسلام کو کھلے الفاظ میں "پیغمبرِ خادع" (نعوذ باللہ) کہتے ہیں، دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو انصاف، رواداری اور بے تعصبی کا مجسمہ ظاہر کرتے ہیں اور گویا پہلے گروہ کے جواب میں سیرت کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ کارلائل کا شمار اسی آخری گروہ میں ہے جس نے

10– Ibid., 63.

11– Ibid., 77.

حضور اکرم ﷺ کو اپنے وقت کا بڑا مصلح اور کام یاب مدبر قرار دیا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ ان پر نازل ہونے والی ربانی ہدایت یعنی قرآن حکیم کے اسلوب کے بارے میں اس طرح کی افسوس ناک رائے ظاہر کی ہے: "متفرق اور منتشر جملے، ایک دوسرے سے غٹ پٹ، ایک ہی بات کی بار بار تکرار، پیچ در پیچ الجھی ہوئی تقریر، مجمل اور مبہم، غرض بالکل مہمل۔۔۔۔۔ کوئی یورپین سوائے اس صورت کے کہ اسے فرض ادا کرنا ہو، سارے قرآن کو پڑھنے کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا۔" (۱۲)

مولانا لکھتے ہیں:

ماشاء اللہ یہ ہے فرنگی داناؤں کے ایک دانا کی رائے، آپ کی اس کتاب سے متعلق جس کا ہم سر و نظیر، معنوی و لفظی، اَدبی و اخلاقی، ہر حیثیت سے آج تک نہ دنیا کا کوئی صحیفہ ہو سکا نہ آئندہ ہو گا اور ظالم نے یہ رائے قائم کیوں کی، قرآن کو پڑھ کر نہیں، قرآن کے انگریزی ترجمے کو پڑھ کر جو کسی مسلمان کا نہیں ایک پادری کا کیا ہوا تھا اور پھر ترجمہ بھی براہ راست عربی سے نہیں بلکہ لیٹن ترجمے کا انگریزی ترجمہ اور خدا معلوم لیٹن کا ترجمہ بھی براہ راست تھا یا وہ بھی بالواسطہ تھا۔ یہ ہے دانایانِ فرنگ کی دانائی اور احساسِ ذمہ داری کہ واسطہ در واسطہ کا ترجمہ اور وہ بھی دشمن کے قلم سے۔۔۔۔۔ مرعوب اور غلامانہ ذہنیت کا نوجوان مسلمان ان چیزوں کو پڑھ کر خود یہ سوچنے لگتا ہے کہ جب ایسے بڑے شخص اور اتنے بڑے محققِ عالی دماغ نے یہ رائے ظاہر کی ہے تو کچھ نہ کچھ اصلیت تو اس کی ضرور ہو گی۔۔۔۔۔ اور یہی وہ فتنہ ہے جو ساری انگریزی تعلیم، انگریزی تمدن، انگریزی حکومت کے عقب میں مخفی ہے۔ (۱۳)

کارلائل نے نہ صرف قرآنِ حکیم کے اسلوبِ بیان پر حرف رکھا، بلکہ حضور ﷺ پر اترنے والی وحی اور اس کو لانے والے فرشتے کے بارے میں بھی تشکیک آفرینی کی ہے۔ کارلائل کا خیال ہے کہ جہل و ضلالت میں غلطاں صحرائے عرب کی تاریکی میں بالآخر وہ روشنی داخل ہوئی جو گو منتشر تھی، مگر اس میں زندگی کی آسمانی جگمگاہٹ اور خیرگی شامل تھی۔ محمد ﷺ نے اسے وحی قرار دیا اور فرشتے کا نام جبرئیل رکھا۔۔۔۔۔ یہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ قول دریابادی بہ ظاہر حضور ﷺ پر کذب و بددیانتی کا الزام کہیں نہیں، بلکہ خلوص و حسنِ نیت کا اعتراف، لیکن اندر ہی اندر زہر پھیلتا چلا جارہا ہے اور حضور ﷺ کے دعوے کی تردید قدم قدم پر جاری ہے۔

یہ درست ہے کہ کارلائل نے خطبے کے آغاز میں حضورؐ کے لیے "God-inspired" (خدا کی طرف سے الہام کیا گیا) اور آگے چل کر ان کے پیغام کو "Heaven's message" (پیام سماوی) قرار دیا ہے، مگر نہایت کاری گری سے وحی کے بارے میں تشکیل دادہ اس کے مذکورہ ملفوف بیان کی تلافی مندرجہ بالا الفاظ و تراکیب

۱۲- عبدالماجد دریابادی، **سلطانِ ما محمدؐ** (لاہور: مکہ بکس، س ن)، ۹۹-۱۰۰۔

۱۳- نفسِ مرجع۔

سے نہیں ہو سکتی۔ حیرت ہے کہ فلپ کے ہٹی نے کارلائل کے لیکچر "Hero as a Prophet" کے بارے میں یہ جو لکھ ڈالا ہے کہ اس کی تعبیرات میں کوئی تکلیف دہ بات نہیں اور یہ کہ اس پر اگر تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ یہ غیر تنقیدی ہے: "Indeed it might be criticized for being uncritical"۔ (۱۴) سو اس پر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ خود ہٹی کو کارلائل کے سحر کارانہ اسلوب کا تیز دھارا اپنے ساتھ بہالے گیا ہے اور وہ اس کے بعض بین السطور مضمرات کا پورا شعور حاصل نہیں کر پایا ہے۔ کارلائل کی براءت میں البتہ ایک بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ دیگر خطبوں کی طرح اس کے اس خطبے کے اوّلیں مخاطبین بھی مسلمان نہ تھے، وکٹورین سائنس سے بری طرح مرعوب اور مادہ پرست برطانوی اور یورپی حاضرین تھے۔ خود اس کا احساس بہت بعد میں جا کر مولانا دریابادی کو ہو گیا تھا۔ (۱۵)

مولانا دریابادی کا ایک معمول یہ بھی رہا کہ وہ اپنے ہفت روزہ **صدقِ جدید** میں وقتاً فوقتاً لائیڈن سے شائع ہونے والے **انسائیکلوپیڈیا آف اسلام** اور اس کی نئی یا نظر ثانی شدہ اشاعتوں پر اظہار خیال کرتے رہتے تھے اور جہاں ایک طرف اس علمی کارنامے کی تحسین کرتے تھے، وہیں اس میں موجود علمی کم زوریوں یا تعصبات کو بھی طشت ازبام کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب مستشرقین کے تعصبات میں کمی آ گئی ہے اور اس کے چند در چند اسباب میں ایک یہ بھی ہے کہ اب خود اہلِ مشرق میں فرنگی علم و تحقیق کی وہ مرعوبیت باقی نہیں رہی جو دو ایک پشت قبل تک قائم تھی۔ پھر اس تعدیل کا ایک بڑا سبب خود بعض مغربی دانش ور مثلاً آرنلڈ، براؤن، راس، آربری اور ہٹی اور ان کے نامور مسلم حریف امیر علی، عبداللہ یوسف علی، پکتھال، اقبال اور ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہ رہے ہیں، تاہم اس سب کے باوجود:

> اب بھی مغرب، مغرب ہے اور مشرق، مشرق۔ بدزبانیوں کا دور اب ختم ہو چکا ہے، لیکن بدگمانیاں اب بھی دونوں کے درمیان بعد المشرقین قائم رکھے ہوئے اور فاضل ایڈیٹروں اور ان کے نامیوں کی کوشش اب تک اس وضع داری کو نباہے چلی جا رہی ہیں کہ پیام اسلام کی حقانیت، رسولؐ کی صداقت اور کلام مجید کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق کا کوئی شائبہ بھی کسی

14– Hitti, op.cit., 61.

۱۵– اس ضمن میں ان کا شذرہ بہ عنوان "سچی باتیں" **صدقِ جدید**، (شمارہ یکم نومبر ۱۹۶۳ء) ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس میں کارلائل کے ساتھ ساتھ ڈچ مستشرق DeJoeje، گوئٹے، آرنلڈ اور فلپ کے ہٹی کے اسلام اور پیغمبر اسلام کے باب میں ہم دردانہ موقف کی خوب تحسین کی گئی ہے۔

مقالے سے نہ پیدا ہونے پائے اور اس سلسلے کے ہر واقعے کو توڑ موڑ کر مسخ و تلبیس کے ساتھ ہی پیش کیا جائے کہ پڑھنے والا جب کتاب بند کرے تو اپنے قلب و دماغ کو اسلام سے دور تر ہی پائے۔ [۱۶]

اس نتیجہ گیری کے بعد مولانا ماجد نے **انسائیکلوپیڈیا آف اسلام** کے نئے ایڈیشن کے ایک اندراج بہ عنوان "آزر" پر اس کے مصنف آرتھر جیفری کو ہدف تنقید بنایا ہے اور تالمود کے بعض مشمولات سے اس کی بے خبری اور بعض لسانی حقیقتوں سے اس کی چشم پوشی کا ماتم کیا ہے۔

مولانا دریابادی کا مندرجہ بالا اقتباس آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اس میں انھوں نے بدزبانیوں کے دور کے جس خاتمے کا ذکر کیا ہے، خلیجی جنگ اور نائن الیون کے بعد اب ان میں پھر ایک نئی قوت، شدت اور تیزی آگئی ہے۔ آخر کلنٹن بینٹ (Clinton Bennett) کی *In Search of Mohammad* اور پیٹریشیا کرون/مائیکل کک کی *Hagarism: The Making of the Islamic World* کی زہر چکانی کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے!

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اجمالاً ایک ایسی کتاب کا ذکر کر دیا جائے جو مسلم علمی و ادبی حلقوں میں خصوصی ذکر کی مستحق ہے اور جسے جرمنی میں انگریزی اور امریکی ادب کے استاد آئی اَن آمنڈ (Ian Almond) نے "The New Orientalists" کے زیر عنوان ۲۰۰۷ء میں انگلستان سے شایع کیا ہے۔ اس کتاب میں آمنڈ نے نٹشے سے لے کر دریدا، میشل فوکو، ژاں بادر لارد (Jean Baudrillard)، جولیا کرسٹیوا، بورخیس، رشدی اور اورہان پامک وغیرہ کی تحریروں کا جائزہ لے کر ان کے یہاں مستعمل مسلم مشرق کے علائم و استعارات اور ان کے تناظر میں جدیدیت پر تنقید کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس نے اسلام اور عرب دنیا کے بارے میں ان مابعد جدید دانش وروں کے ہاں پائے جانے والے مفروضات، متروکات اور تعصبات کا جائزہ لیا ہے اور اس باب میں ضیاء الدین سردار، عزیز الاعظمی اور بوبی ایس سید سے استفادہ کر کے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ یہاں کتاب کے تمام مشمولات کے ذکر کا تو موقع نہیں۔ صرف دریدا Derrida کے اسلام کے بارے میں تاثرات کا اجمالی ذکر بے موقع نہ ہوگا؛ گو کہ مصنف نے آغاز ہی میں کہہ دیا ہے کہ دریدا کی تحریروں میں اسلام مرکز میں نہیں، محض حاشیے میں جگہ پاسکا ہے۔ آمنڈ کے خیال میں دریدا کے ہاں اسلام کہیں تو یہودیت اور عیسائیت کے ایک حصے دار کے طور پر توحید کے علم بردار کے طور پر ظہور کرتا ہے اور کہیں مغربی جمہوریت کے بالمقابل "عربِ بیگانہ" کی حیثیت سے اور تشدد اور جنونیت کے ذخیرے کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اپنی کتاب *Knowledge & Faith* میں دریدا

۱۶- دریابادی، **صدق جدید**، لکھنؤ، (۱۲؍دسمبر ۱۹۵۸ء)، ۴۔

"Islam As Brother & Islam As Others" کے تضاد اور ثنویت کے مابین جھولتا نظر آتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ دریدا کے نزدیک تینوں ابراہیمی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام اس بنا پر مذاہبِ کتاب (Religions of the Book) نہیں کہ یہ تینوں وحی کے فیض یافتہ ہیں، بلکہ اپنے خارجی مراسم و خصائص کی وجہ سے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ کہیں کہیں وہ، بہ قولِ مصنف، اسلام کی واضح انفرادیت پر بھی زور دیتا ہے اور یورپیوں کے لیے اسلام کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> For, 'We Europeans', a phrase Derrida employs with not completely convincing irony, Islam brings out the worst in us and it is precisely this process that Derrida finds so necessary to our self-understanding. (17)

(ہم یورپی اقوام، (ایک لقب جو دریدا مکمل طنز کے ساتھ استعمال کرنے سے قاصر ہے) کے لیے اسلام ہمیں ہماری بدترین شکل دکھاتا ہے اور یہی وہ جہت ہے جسے دریدا ہماری خود فہمی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔)

گویا مغربیوں کو اپنے باطن میں غوطہ زن ہو کر اپنے تاریک منطقوں کی نشان دہی کے لیے اسلام کی ضرورت ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے مابعد جدیدی خیالات سے مجبور ہو کر اور کثرت آرائی خیال کا حامی ہونے کے باعث دریدا "متعدد اسلاموں" پر بھی اصرار کرتا ہے جو دراصل روحِ اسلام سے اس کی عدم آگاہی کا مظہر ہے، مگر اس کے فلسفۂ تکثیریت کے عین مطابق!

کہنا یہ ہے کہ آج کی مغربی دنیا میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر گفت گو اور بحث مباحثے کا ایک طوفان اٹھا ہوا ہے۔ ہم اہلِ اسلام کا فرض بنتا ہے کہ اسلام کے آفاقی پیغام کو حکیمانہ انداز میں اس کی اصل عالمی اور احترام پسندانہ روح کے ساتھ اہلِ عالم کے سامنے پیش کریں۔ مکالمے اور بین المذاہب گفتگو کے رستے کھولیں اور اسلام کی حرکی روح سے استفادہ کر کے ایجاد، اختراع اور تسخیرِ فطرت کو اپنا ہدف بنا کر وہ وقار اور اعتماد حاصل کرنے کی سعی کریں جس سے ہم من حیث الملّت اس وقت محروم ہیں۔ ہم مغربی استعمار کی استشراقی چالوں کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم مغرب کی سی بے قرار روحِ علمی سے بہرہ ور نہیں ہو جاتے اور علوم و فنون اور اَلسنہ کے بحرِ ذخّار میں اہلِ مغرب کی طرح غوطہ زن نہیں ہو جاتے۔ ایسے میں مولانا دریابادی جیسے علما کی تحریریں ہمارے لیے مشعل

17– Ian Almond, The New Orientalists: Postmodern Representations of Islam from Focault to Baudrillard (London: I.B. TAURIS, 2007), 59.

راہ کا کام دیتی رہیں گی۔ آج مسلم دنیا کو ایک نئے علمی منہاج کی شدید ضرورت ہے جس کی بنیاد توحید، وسیع النظری اور نامختتم آرزومندی پر رکھی گئی ہو جب کہ فی الوقت ہماری حالت اکبر کے اس شعر کے مصداق ہے:

تھی شبِ تاریک، چور آئے جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

❁❁❁❁❁❁